نوادرِ عبدالرحمن بجنوری: سربیا اور بلغاریہ میں اسلام کی صورت حال

افضل حق قرشی *

عبدالرحمن بجنوری (۱۸۸۵ء۔۱۹۱۸ء) ۱۰/جون [۱] ۱۸۸۵ء ضلع بجنور کے قصبہ سیوہارہ میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر ہی ہوئی۔اس زمانے میں ان کے والد خان بہادر نورالاسلام بسلسلہ ملازمت کوئٹہ میں مقیم تھے۔ابتدائی تعلیم کے بعد اُنھیں سرکاری سکول میں داخل کرایا گیا۔اُنھوں نے سنڈیمن ہائی اسکول کوئٹہ سے ۱۹۰۲ء میں ۳۷۲ نمبر حاصل کر کے درجہ دوم میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔اسی سال ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔۱۹۰۶ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۰۹ء میں قانون کا امتحان ایل ایل بی پاس کیا۔بعد ازاں یورپ چلے گئے۔بار ایٹ لاء کا امتحان لنکنز اِن سے پاس کیا اور جرمنی کی فرائی برش یونیورسٹی سے فقہ اسلامی پر جرمن زبان میں مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف جیورس پروڈنس کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آئے اور مراد آباد میں ایک دو برس وکالت کی لیکن طبیعت جم نہ سکی۔آخر اس پیشہ کو خیر باد کہہ کر مشیر تعلیمات کے عہدے پر فائز ہو کر بھوپال گئے۔ڈیرہ دون میں ایک کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا جہاں جدید طریقے پر صحیح تعلیم وتربیت کا انتظام ہو۔بیگم صاحبہ بھوپال نے اس کی سرپرستی فرمائی اور معقول رقم جمع کر دی۔نظام حیدر آباد نے بھی اس کے لیے رقم عطا فرمائی۔لیکن حکومت کی مخالفت کی بنا پر یہ بیل منڈے نہ چڑھی۔جامعہ عثمانیہ کے قیام کا ڈول بھی اسی وقت ڈالا جا رہا تھا۔پرنسپل کی تلاش تھی۔ بہت غور وفکر اور گفتگو کے بعد قرعہ اُن کے نام پڑا۔عین اس وقت جب عرضداشت بغرض منظوری نظام کی پیش گاہ میں پیش ہونے والی تھی، وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ان کی صلاحیتوں اور کمالات کا اعتراف علامہ اقبال نے شعیب قریشی کے نام ایک خط میں یوں کیا ہے:

> کل شام آپ کے تار نے خرمنِ صبر وقرار پر بجلی گرادی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔افسوس کہ گذشتہ [پچاس] ساٹھ سال کی تعلیمی کش مکش کے بعد ایک آدمی ہم میں پیدا ہوا تھا جو دل ودماغ وسیرت کے اعتبار سے قدیم حکماء اسلام کا نمونہ تھا۔مگر مشیتِ ایزدی نے اسے ہم سے عین اس وقت جدا کر [دیا] جب کہ اس کی [سخت] ضرورت تھی۔شاید مرحوم اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا تھا یا جس سوسائٹی میں اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تھا وہ اس کی قدر نہ پہچان سکی تھی۔ ہندوستان کی اسلامی دُنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جن کو بجنوری کی پوشیدہ قوتوں کا احساس ہوگا اور کیا عجب کہ مرحوم کو خود بھی ان قوتوں کا احساس نہ ہو۔لیکن اگر وہ دس سال ہم میں اور رہتا تو آنکھیں اس کے کمالات کی آب وتاب سے خیرہ ہو جاتیں [۲]۔

* سابق استاد، شعبۂ صحافت، جامعہ پنجاب۔ مدیر، مجلہ ''صحیفہ''، مجلس ترقی ادب لاہور

ان کی کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے مسودہ ایکٹ انسٹی ٹیوٹز، ریگولیشنز وغیرہ پر مفصل بحث۔ مراد آباد: مطبع شمس المطابع، ۱۹۱۵ء۔

۲۔ ہندو یونیورسٹی ایکٹ اور مجوزہ مسلم یونیورسٹی، آگرہ: مفید عام پریس، ۱۹۱۶ء

۳۔ ان کی وفات کے بعد مضامین کے دو مجموعے باقیاتِ بجنوری، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۴۰ء اور یادگارِ بجنوری، مرتبہ محمد فاتح فرخ، کراچی: مطبوعہ سول اینڈ ملٹری پریس (س۔ن) شائع ہوئے۔

مندرجہ ذیل دونوں مضامین جو مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸-۱۹۳۱ء) کے ہمدرد کی ۱۱ر جون ۱۹۱۳ء اور ۲۲ر جون ۱۹۱۳ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئے تھے، مذکورہ بالا دونوں مجموعوں میں شامل نہیں اور نہ ہی ڈاکٹر محمد زاہد کو اپنی پی ایچ ڈی کی تحقیق کے سلسلے میں دست یاب ہوئے ہیں۔

سرویا[۳] میں اسلام

(۱)

میں نے کامریڈ میں مسلمانانِ چین اور روس کے متعلق مختلف مضامین کو گہری دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی مطالعہ کا اثر ہے کہ میرے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ قسطنطنیہ جاتے ہوئے مَیں سرویا اور بلغاریہ کے مسلمانوں کے حالات سے واقفیت حاصل کروں۔ مجھے ان ریاستوں میں تقریباً دو ہفتے تک ٹھہرنے کا اتفاق ہوا اور مَیں خوش ہوں کہ اس قلیل عرصہ میں مجھے کافی مواقع مل گئے جن کی وجہ سے مَیں سچے اور قابلِ اعتبار حالات معلوم کر سکا۔

سرویا میں مَیں ''نیش'' اور دارالسلطنت میں مقیم رہا۔ بلگیریہ [بلغاریہ] میں مجھے حضرت شیخ المفتیان کا مہمان ہونے کی عزت نصیب ہوئی اور زیادہ تر یہی بزرگ میری معلومات کا ذریعہ ہیں۔ محمد رمزی بے تقریباً تیس سال کے ایک نوجوان عالم ہیں لیکن کوئی شخص جس نے ہمارے ہندوستان کے علماء دیکھے ہیں اُن کے عالم ہونے کی نسبت رائے قائم نہیں کر سکتا۔ اگر اُن کی وضع قطع دیکھنی ہو تو علی گڑھ کے کسی اولڈ بوائے کو دیکھ لیجیے۔ جہاں تک اُن کی محدود آزادی اُنھیں اجازت دیتی ہے وہ سرویا میں اپنے ہم مذہبوں کے حالات کو بہتر بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم نے آپس میں دُنیائے اسلام کی موجودہ حالت کی نسبت اکثر مفصل گفتگو کی ہے لیکن موقع اور محل کے خیال سے میں یہاں سروی مسلمانوں کے حالات لکھنے پر کفایت کروں گا۔

سرویا میں ان مسلمانوں کا شمار جو سروی حکومت کی رعایا ہیں بیس ہزار ہے۔ یہ تعداد گورنمنٹ کے اندراجات کے مطابق ہے اور خود مفتی صاحب بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاص بلگریڈ [بلغراد] میں ایک اور دو ہزار کے درمیان غیر سروی مسلمان آباد ہیں جو معمولی قسم کی تجارت کی غرض سے آتے ہیں۔ غیر ملکی بالعلوم البانیا اور بوسینیا کے

باشندے ہیں اور جب کبھی وہ سرویا آتے ہیں تو اپنے اہل وعیال کو تقریباً ہمیشہ اپنے پیچھے اپنے اپنے گھروں میں چھوڑ آتے ہیں کیوں کہ یہاں پر مسلمانوں کی ذاتی حفاظت کی بہت کم کفالت کی جاتی ہے۔

اگرچہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ سرویا سلطنتِ عثمانی کی زیرِ نگیں تھا مگر اب اُن کی حکومت اور ان کے قبضے کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔ بلگریڈ [بلغراد] میں اُن کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اگر اب بھی کچھ باقی ہے تو وہ چند ترکی توپوں کے علاوہ ترکی قلعہ کے کھنڈرات ہیں یا ایک حمام اور مشہور ومعروف مجاہد مصطفی پاشا کا مقبرہ۔ باقی تمام یادگاریں گورنمنٹ اور دیگر عیسائیوں کے ہاتھوں تمام وکمال تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔ مصطفی پاشا کی قبر کی لوحِ مقبرے کے احاطے سے باہر ٹوٹی پھوٹی پڑی ہوئی ہے۔ دروازہ کی محراب کا کتبہ سب کا سب مٹا دیا ہے۔ صرف ایک لفظ مصطفی باقی رہ گیا ہے۔ یہ حرکت اس وقت کی گئی تھی جبکہ چند سال پیشتر عیسائی تعصب جو ہمیشہ کچھ عرصہ کے بعد بھڑکا کرتا ہے بڑے زور شور کے ساتھ پھوٹ نکلا تھا۔ سرویا میں اب کوئی ترک نہیں پایا جاتا سوائے ان چھ خاندانوں کے جو نیش اور بلگریڈ [بلغراد] میں آباد ہیں۔ بلگریڈ [بلغراد] میں مجھے ایک ستر برس کے بوڑھے آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا جو ترکی دورِ حکومت کی یادگار ہے۔ جب میں نے اُس سے دریافت کیا کہ اس زمانے سے لے کر اب تک ملک میں کیا کیا انقلابات واقع ہوئے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ ''آفندم! صرف اتنا کہ جہاں جہاں اب مکان ہیں وہاں پہلے سڑکیں تھیں اور جہاں جہاں اب سڑکیں ہیں وہاں پہلے مکانات تھے۔ جہاں پہلے مساجد تھیں وہاں اب قہوہ خانے نظر آتے ہیں۔ الغرض ہر جگہ اور خصوصاً بلگریڈ [بلغراد] میں عیسائیوں نے کچھ نہیں چھوڑا۔ سرویا میں مجھے پہلی دفعہ یہ بات معلوم ہوئی کہ عیسائی یورپ بلقان کے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ کر چکا ہے اور ابھی تک کیا کر رہا ہے۔ میرا جسم کانپنے لگتا ہے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر یورپ کے ظالم ہاتھ کو روکا نہ گیا جیسا کہ یقین ہے کہ ٹرکی روک لے گا تو خدا جانے آگے چل کر مسلمانانِ بلقان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اگر میں اسی مضمون کو ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کروں تو مجھے ڈر ہے کہ مَیں اس مضمون کے موضوع سے باہر نکل جاؤں گا۔ اگرچہ مَیں نے جو کچھ خود اپنی آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا ہے اُس نے مجھے بالکل دیوانہ کر دیا ہے۔

مسلمانوں کی مادی حالت بہت خراب ہے اور جو کچھ سیاسی، اقتصادی اور تمدنی دباؤ اُن پر ہمیشہ ڈالا جاتا ہے، اُسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی حالت کیوں خراب نہ ہو۔ اس کے خلاف ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ملک بھر میں ایک مسلمان بھی دولت مند نہیں ہے۔ سوائے چند نفروں کے جو معمولی حیثیت سے گزر کرنے کے قابل کما لیتے ہیں یا قدرے فارغ البال ہیں، باقی سب کے سب کاشتکاروں کی مزدوری کر کے پیٹ پالتے ہیں۔ سروی سیاست کا سارا رجحان یہ ہی ہے کہ مسلمانوں کو بالالتزام مفلس بنا دیا جائے تاکہ ضروریات سے مجبور ہو کر وہ یا تو مرکھپ جائیں یا مذہب عیسوی قبول کر کے عیسائیوں میں ضم ہو جائیں۔ لیکن مسلمان اگرچہ متاعِ دنیوی کے اعتبار سے مفلس ہیں تاہم وہ اُن اعلیٰ اخلاقی اور تمدنی نیکیوں اور برکتوں سے مالا مال ہیں جو اسلام کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ وہ ملک بھر میں ہر جگہ سادہ تر اور پاکیزہ تر زندگی بسر

کرنے والے مشہور ہیں۔شراب خواری، قمار بازی اور بدکاری کے اخلاق ذمیمہ اُن میں نسبتاً مفقود ہیں۔عیسائیوں کی بہ نسبت اُن کی خاندانی زندگی بزرگ قبیلہ کے زیادہ تحت حکم ہے۔

عورتیں آزادی کے ساتھ باہر آتی جاتی ہیں۔لیکن پردہ کا رواج ہے اور اُن کا تمام جسم اور چہرے کا زیادہ حصہ ڈھکا رہتا ہے۔تعدد ازدواج شاذ و نادر بلکہ معدوم ہے۔غرباء کے طبقہ میں مرد و عورت کا لباس عیسائیوں کے لباس سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور میرا یقین ہے کہ اس اختلاف کی وجوہ ضروریاتِ زندگی کی خصوصیات، رسمِ پردہ اور عیسائیوں سے ممتاز رہنے کی خواہش ہے۔

لیکن ان کی پہچان کی سب سے زیادہ آسان علامت ترکی ٹوپی ہے کیوں کہ یہ رفتہ رفتہ یقینی طور سے دُنیا بھر کے مسلمانوں کا قومی لباس بن رہی ہے۔یہاں کے مسلماں اگرچہ نسلاً سروی ہیں تاہم وہ اپنے غیر مسلمان ہم وطنوں سے خط و خال میں بھی مختلف ہیں۔میرے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ گرد و پیش کے حالات شکل و شباہت پر اپنا عکس ڈالتے ہیں۔اگر میں یہ کہوں کہ مسلمان سروی عام شباہت میں افغانیوں اور بلوچیوں سے ملتے جُلتے ہیں تو غالباً غلط نہ ہوگا۔جو لوگ خوش حال ہیں یا ترک ہیں۔وہ یورپین یا ترکی لباس پہنتے ہیں اور با اعتبار طرزِ ماند و بود ترکوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

(۲)

ہر قسم کے موانعات مسلمانوں کی سدِّ راہ ہیں۔اُن کے لیے نہ رواداری ہے نہ انصاف۔انھی کا ہر فرد بشر عیسائیوں کے ظلم اور سرکاری دباؤ کا شکار ہو رہا ہے۔کاشتکاروں کی حالت بعینہٖ غلاموں کی سی ہے اور عام طور سے جو سلوک ان کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ وحشیانہ اور بے رحمانہ ہوتا ہے۔اُن کی بیخ کنی یا جبری تبدیلی مذہب کی تمام خلافِ قانون اور مجرمانہ کوششوں میں گورنمنٹ ہمیشہ معاون رہتی ہے۔ترکی گورنمنٹ کی مداخلت کی وجہ سے انھیں صرف چند ہی سال سے اس امر کی اجازت ملی ہے کہ وہ مساجد میں جا کر علانیہ نماز پڑھ سکیں اور اذان دے سکیں۔اب بھی سرویا میں چند ہی مسجدیں ہیں اس لیے کہ گورنمنٹ مسجدیں بنانے نہیں دیتی۔بلگریڈ [بلغراد] میں صرف ایک مسجد ہے۔تھوڑے عرصے کی بات ہے کہ وہاں گیارہ مسجدیں تھیں مگر وہ سب کی سب یکے بعد دیگرے مسمار کر دی گئیں لیکن باوجود اس کے مسلمانوں کی تعداد میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔اسلام کی محفوظ رکھنے والی خوبیوں نے انھیں ہمیشہ بچایا ہے ورنہ وہ گرد و پیش کے ایسے ناموافق حالات کی وجہ سے کبھی کی غارت ہو چکی ہوتیں۔یہ لوگ نہایت مذہبی خیال کے ہیں اور اُن سب کے دلوں میں اسلام کی محبت ہے۔کسی انعام کے وعدہ یا سزا کی دھمکی کی وجہ سے ان کا ایمان متزلزل نہیں ہو سکتا۔اُس وقت بھی جبکہ صورتِ حالات انتہائی درجہ پر پہنچ جائے وہ اسلام سے مُرتد ہونے پر مر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔لیکن موجودہ حالات میں مسلمانانِ عالم کے لیے مذہب کی قوت صرف ایک آلۂ مدافعت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ قوت عرصہ دراز تک ان تمام متحدہ قوتوں کا تنہا مقابلہ نہیں کر سکتی جو مسلمانوں کی ہستی کو معرضِ خطر میں ڈال رہی ہیں۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بہ طیبِ

خاطر اپنی حالت میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرلیں جو گردونواح کے حالات وواقعات کے بالکل موافق ہوتا کہ جہد للحیات میں وہ فتح پاسکنے کے قابل ہوں۔ یہ تبدیلی صرف ایسی تعلیم حاصل کرنے سے پیدا ہوسکتی ہے جو انھیں زمانہ کے نئے حالات کے مطابق بنادے۔ سرویا کے مسلمانوں میں تعلیم کی نہایت قابلِ افسوس کمی ہے مگر اس میں اکیلے انھی کی خطا نہیں۔ دوسری رعایا کی طرح تعلیمی مقاصد کے لیے گورنمنٹ اُن سے بھی ٹیکس وصول کرتی ہے لیکن جو رقم وہ سرکاری مدارس کی امداد وقیام کے لیے ادا کرتے ہیں انھیں اس کا ایک حصہ قلیل بھی واپس نہیں ملتا۔ مسلمانوں کی تعلیم گاہیں دراصل مکاتب ابتدائی تک محدود ہیں جنھیں گورنمنٹ سے برائے نام امداد ملتی ہے۔ چونکہ مسلمان غریب ہیں اس لیے وہ بجائے خود اس سے زیادہ کوشش کرنے سے قاصر ہیں۔ اکثر اسلامی مدارس میں صرف ایک ہی معلّم ہے اور اکثر اوقات اسی مدرس کو مختلف مدرسوں میں پڑھانے کے لیے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانا پڑتا ہے۔ تعلیم زیادہ تر مذہب کے متعلق ہوتی ہے جو سروی زبان میں دی جاتی ہے مگر مسلمانوں کی کتابی زبان ترکی یا عربی ہے۔ ریاضی کے علاوہ جغرافیہ، تاریخ اور تھوڑی سی ترکی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن ترکی کے پڑھنے پڑھانے کو گورنمنٹ شبہ اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بلگریڈ [بلغراد] میں ایک سرکاری یونیورسٹی ہے مگر وہاں صرف دو (۲) مسلمان تعلیم پا رہے ہیں جن میں سے ایک بھی سروی نہیں ہے۔ وہ دونوں بوسینیا کے رہنے والے ہیں۔ ان میں سے ایک تو علمِ ریاضی حاصل کر رہا ہے اور دوسرا علم اللسان۔ سال آئندہ بوسینیا سے تقریباً بیس طلباء کی اُمید کی جاتی ہے۔ میں نے اس کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ اگر تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ان میں سے کچھ طالب علموں کو سرویا میں رہنے کی اجازت مل گئی تو وہ تھوڑے عرصہ کے بعد تعلیمی ضروریات میں سروی مسلمانوں کو کافی مدد دے سکیں گے۔ لیکن مجھے اس امر کا ذکر کردینا چاہیے کہ یہاں دو (۲) سروی ایسے بھی ہیں جو یورپ سے فارغ التحصیل ہوکر آئے ہوئے ہیں اور جن کا تعلق مذکورہ بالا دو ترکی خاندانوں کے ساتھ ہے۔ ان میں سے ایک صاحب ''نیش'' میں ہیں اور دوسرے بلگریڈ [بلغراد] میں۔ دونوں صاحب ہائی اسکولوں میں پروفیسر ہیں۔ گورنمنٹ کی نگاہ میں مسلمانوں کی کچھ وقعت نہیں ہے۔ قوانین کا وجود ان کے لیے برائے نام ہے۔ ان کو فوجی خدمت سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے اور یہاں کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں ہے جو کسی ذمہ دار ملکی عہدہ پر فائز ہو۔ گورنمنٹ کے مسلمان ملازمین کی تعداد کلہم سو کے قریب ہے اور یہ سب کے سب ادنیٰ درجہ کے کم حیثیت عہدوں پر ملازم ہیں۔ قانوناً تو ایک مسلمان کا درجہ بھی عیسائی کے درجہ کے مساوی ہے لیکن کسی مسلمان کو اپنے مقدمہ میں انصاف کی اُمید ہرگز نہ رکھنی چاہیے جبکہ فریقِ ثانی عیسائی ہو۔ مناکحت اور وراثت کے معاملات میں شرع محمدی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ معاہدہ نکاح مفتیوں کے ذریعے سے ہوتا ہے اور درخواست ہائے انفساخ نکاح یا نزاعات متعلقہ مہر انھیں مفتیوں کی عدالت ہائے ازدواجی ہی میں پیش ہوتی ہیں۔ تملیک جائیداد اور تقسیم وراثت کے تمام مقدمات کی سماعت شیخ المفتیان خود کرتے ہیں۔ لیکن ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ شریعت کے قانون کو چھوڑ کر قانونِ دیوانی کے تحت حمایت آجائے۔ ان اسلامی عدالتوں میں قانونِ شہادت

اور ضابطۂ فوجداری و دیوانی بھی اسلامی ہے۔

اسلامی دُنیا کے اتحاد کا خیال سروی مسلمانوں کے دلوں میں بھی موجود ہے۔ خطبہ خلیفہ کے نام کا پڑھا جاتا ہے جو یہاں محمد خلیفۂ محمدؐ رسول اللہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

اٹلی و ترکی کی لڑائی نے گہرے تعلقات کے احساس کو بیدار کر دیا ہے اور میں نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ ہر شام شیخ المفتیان کے پاس آیا کرتے تھے اور طرابلس کے مجاہدین کے متعلق تازہ خبریں سنا کرتے تھے۔ ترکوں کی فتح کے لیے ہر روز دُعائیں مانگی جاتی ہیں اور تقریباً ہر مہینہ ایک معتد بہ رقم انجمن ہلالِ احمر کے نام روانہ کی جاتی ہے۔

جو مآل و مستقبل دُنیا کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کا ہونے والا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ وہی مآل و مستقبل ان بیس ہزار مسلمانوں کا ہوگا۔ اسلام میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہوگئی ہے اور جو قدم پڑ رہا ہے، آگے ہی کو ایک منظم ترقی کی جانب پڑ رہا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ ایک متلاشیِ حیات اندھا جذبہ ہے جو ایک زبردست اور باخبر قوتِ ارادی کا منتظر ہے اور جس کا آنا اپنے وقت پر یقینی ہے۔ اُسی کے لیے سب کو سعی کرنی چاہیے۔

عبدالرحمن سیوہاروی

از مقام بلگریڈ

بلغاریہ[۴] میں اسلام

(۱)

سرویا کے دارالخلافہ سے رخصت ہو کر میں بلغاریہ کے دارالسلطنت میں آیا۔ جب میں صوفیہ پہنچا تو میری نظر دور سے ایک گرجا پر پڑی جو روسی اور بازنطینی طرز کا تھا۔ جس کے گنبد کا سنہری کلس بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ میرے زیادہ قریب آنے پر اس کی قد و قامت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا حتیٰ کہ جب میں اس کے نیچے آیا ہوں تو تو سامنے بس اس کی تصویر دکھائی دیتی تھی اور اپنی طاقت کا اظہار کر رہی تھی۔ بلقان کے دوسرے دارالخلافوں کی طرح صوفیہ بھی ایک نیا تعمیر شدہ شہر ہے۔ شہر کی عمارتیں علی العموم بیش قیمت ہونے کے علاوہ اعلیٰ اُصول انجینئری کے موافق بنائی گئی ہیں مگر شہر بے رونق ہے اور عمارتوں کی یکسانیت کے اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل صوفیہ کسی دوسرے شہر کی نقل ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا سینٹ پیٹرزبرگ ہے جو اہلِ مشرق کے حلقۂ اثر سے نکلنے کے لیے اہلِ مغرب کی ایک ناکامیاب بغاوت کا اظہار کرتا ہے۔ آبادی مختلف عنصروں سے مرکب ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ایسی ریاست کے دارالخلافہ میں جو ابھی سلطنتِ عثمانیہ کے شہنشاہانہ سیادت سے علیحدہ کی گئی ہے کوئی مسلمان نہیں ہے۔ یہاں پچاس سے زیادہ ترک آباد نہیں ہیں

مگر باوجود اس کے میں نے یہ معلومات حاصل کر لی [کذا۔لیں] کہ مجھے کہاں جانا چاہیے اور یہی امر میرے لیے باعثِ تسکین تھا۔ دوسرے روز میں تفریح کے طور ''کنگزوے'' سڑک پر اچھی پوشاک پہنے ہوئے آدمیوں کے انبوہِ کثیر میں سے گزر رہا تھا جن میں بہت سے فوجی افسر بھی اپنی وردیاں ڈاٹے جا رہے تھے، جن کی تلواریں سڑک پر گھسٹتے وقت کھڑکھڑاتی تھیں، یورپین زندگی کی تھکا دینے والی یکسانیت سے میں سخت پریشان ہو رہا تھا۔ اتنے میں میری آنکھیں ایک عورت کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں پر پڑیں جو میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے بال اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی طرح سیاہ تھے اور اس کی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ میری طرح سیاہی مائل بھورا تھا اور مسکراتے وقت اس کے دانت نہایت تیزی سے چمکتے تھے۔ سر پر ایک سفید دوپٹہ پڑا تھا جس نے اس کے جسم اور بالوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ وہ بہت چپ چاپ اور غریب نظر آتی تھی۔ مگر ایسی کونسی بات تھی جس کی وجہ سے اس نے خاص مجھے ہی اپنی خوبصورت اور موثر آنکھوں سے ایک جگہ قائم کر دیا؟ میں نے اس کو ہر ایسے ممکن طریقہ سے مخاطب کیا جس میں کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ لیکن نہ تو اس نے میری بات سمجھی اور نہ میں نے اس کی۔ مجھے اس کے اشارات ویسے ہی عجیب معلوم ہوتے تھے جیسے کہ یقیناً اس کو میرے معلوم ہوتے ہوں گے۔ اسی اثنا میں یکا یک میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ میں نے کلمۂ شہادت دہرایا اور معاً اس نے خوشی میں میرے ہاتھوں کو اپنے خوبصورت نازک ہاتھوں سے دبا کر کہا کہ:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اور مسرت کے جوش میں ہنستی ہوئی چلی گئی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک ''جپسی'' عورت ہے اور میرے خیال میں ماہرین علم السنہ اور علم النساب کے اس خیال میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے کہ ''جپسی'' (آوارہ گرد) قوموں کا اصلی وطن ہندوستان ہے۔ بعد میں مجھے اس واقعہ کا علم ہوا کہ صوفیہ میں چھ اور سات ہزار ''جپسی'' مسلمان آباد ہیں۔

صوفیہ سے میں فلیبہ (یعنی فلی پوپل) آیا کیوں کہ یہ مقام بلغاری مسلمانوں کا مرکز ہے۔ اس شہر کا عام منظر بلغراد کی طرح ہے اور یہاں عیسائیوں اور مسلمانوں کی مخلوط آبادی ہے، لیکن مسلمان جن میں ''جپسی'' بھی شامل ہیں، بارہ ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔ جب میں اسٹیشن سے گاڑی میں بیٹھ کر چلا تو میرا گزر ایک مسجد کے قریب ہوا جہاں ایک مسلمان شربت والا چند برقعہ پوش مستورات کو ٹھنڈا ترکی کا شربت پیش کر رہا تھا۔ ماہِ رمضان میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ چند مزدور جو اپنے پسینہ آلود سروں پر ترکی ٹوپیاں رکھے ہوئے تھے، ذرا فاصلے سے زمین کھود رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ترک بھی راستہ چلتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا جسے مَیں عیسائی بلغاری عورتوں اور مردوں کے اژدہام کی وجہ سے بمشکل پہچانتا تھا۔ یہ تصویر کا کوئی شاندار رُخ نہیں ہے لیکن صوفیہ کی مایوسی بخش حالت کے بعد میرے لیے کم سے کم یہ ایک دل خوش کُن نظارہ تھا۔

اگلی صبح کو میں اخبارِ بلقان کے اڈیٹر سے ملنے گیا۔ بلغاریہ میں صرف یہی ایک اسلامی اخبار ہے جس کی نسبت میں نے صوفیہ ہی میں واقفیت بہم پہنچالی تھی۔ مجھے ملاقات کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ادھم روحی بے اپنی ایڈیٹر کی کرسی پر

بیٹھے ہوئے تھے۔دفتر اچھے ہندوستانی اخبار کے دفتر کی مانند نہ تھا۔وہ میانہ قد کے آدمی ہیں اور چالاک اور پھرتیلے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے چہرے سے حلم اور تدبر کے آثار نمایاں ہیں۔یہ حضرت بلغاریہ کے تین مسلمان لیڈروں میں سے ایک ہیں اور یہ انجمن ثلاثہ اپنی طاقت اور وقت کو اپنے ہم مذہبوں کی ترقی میں صرف کرتی ہے جو اگرچہ کبھی ملایے اعلیٰ پر تھی مگر اب انقلابِ زمانہ سے قعرِ پستی میں پڑے ہوئے ہیں۔وہ انگریزی بولتے ہیں۔جب میں نے ان سے یہ کہا کہ میں ہندوستان سے آرہا ہوں تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے بہت سے سوالات پوچھیں گے بہ نسبت اس کے کہ جو مجھے ان سے دریافت کرنے تھے۔وہ ترقی کی باتوں پر مسرت اور ادبار کی باتوں پر رنج کا اظہار کرتے تھے،اور اُنھوں نے اور اُن کے دو دوستوں نے میرے سپرد یہ خدمت کی ہے کہ میں بلغاریہ کے مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان کے مسلمانوں کو محبت اور خیراندیشی کا پیغام پہنچادوں۔

گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم

انھوں نے کہا کہ میں تمھیں جامع مسجد دکھانے لے جاؤں گا اور اپنے قلم کو رکھ کر جو ابھی تک ان کے ہاتھ ہی میں تھا انھوں نے اپنا ہاتھ دراز میں ڈالا اور ایک ریوالور کو نکال کر پہلو کی جیب میں ڈال لیا۔مجھے بعد میں دوسرے اشخاص سے معلوم ہوا کہ یہ کارروائی محض احتیاط کے طور پر ہی نہیں ہے بلکہ جہاں تک کہ ان کا تعلق ہے نہایت ضروری ہے۔مسجد اسلامی اور بازنطینی طرز کی عمارت ہے اور اندر سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کی گئی ہے۔ایک قاری قرآن مجید کی نہایت خوش الحانی سے تلاوت کررہا تھا اور بہت سے اشخاص توجہ کے ساتھ بیٹھے سُن رہے تھے۔مسجد کے متصل ایک کلب ہے جہاں ہر شام کو پندرہ اور پچیس کے درمیان نوجوان مسلمان جمع ہوتے ہیں اور ترکی اخبارات پڑھنے کے علاوہ قہوہ پیتے اور اپنے سوشل اور سیاسی معاملات پر رائے زنی کرتے ہیں۔یہاں سے ہم مفتی صاحب سے ملنے کے لیے اسلامی مذہبی عدالت میں گئے اور ہمیں پہلے ہی وقفہ پر اندر بلالیا گیا۔مفتی صاحب جو ایک بزرگ صورت شخص ہیں،سبز لباس میں بیٹھے ہوئے تھے،سر پر ترکی ٹوپی کے اوپر عمامہ بندھا ہوا تھا۔ان کے اسسٹنٹ (نائب) پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے اور دوسرشتہ دار بھی دائیں بائیں تھے۔گفتگو قدرتی طور پر اسلامی دُنیا کی موجودہ پست حالی پر ہوئی۔میں نے آخر میں پوچھا کہ ''جناب اب کیا کرنا چاہیے'' بلغاریہ کے مفتی اور دوسرے بااثر بزرگ نے جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے:

> سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ بوسیدہ اسلامی طریقۂ تعلیم میں جو تمام دُنیا میں رائج ہے،آزادانہ طور پر نمایاں اصلاح کی جائے۔ایشیا،یورپ اور افریقہ کی پرانی مذہبی درسگاہیں جو طالب علم کو ملاگری کے علاوہ اور کسی کام کا نہیں رکھتیں (اور یہ امر اسلام میں ہرگز جائز نہیں ہے) دُنیا میں ہمارے ادبار اور پستی کا سب سے بڑا سبب ہے۔مولوی جسمِ اسلام کا ایک باکار ممبر ہونا چاہیے نہ کہ خوشامد سے اپنے حلوے مانڈے کا خیال رکھنے والا ہو۔

اس گفتگو کے بعد قہوہ پیش کیا گیا اور ہم رخصت ہوئے۔دوسرے دن ایڈیٹر صاحب نے بلغاریہ کے اسلامی مدارس

کے ڈائریکٹر خلیل زکی سے تعارف کرایا۔ وہ پومک یعنی بلغاری مسلمان ہیں۔ وہ مذکورہ بالا ارکانِ ثلاثہ کے دوسرے ممبر ہیں۔ اُنھوں نے جو کوشش مسلمانوں میں موجودہ علوم پھیلانے کے متعلق کی ہے اس کا مقابلہ کسی دوسرے شخص کی کوششوں سے نہیں ہوسکتا۔ اُنھوں نے حال ہی میں فلیبہ میں ایک نارمل اسکول قائم کیا ہے اور وہ اپنی دیگر تجاویز کو بھی جو فی الحال ان کے دماغ میں ہیں، بہت جلدی عملی صورت میں لانے کی کوشش کریں گی۔ وہ مجھے اپنا اسکول دکھلانے کے لیے لے گئے۔ عمارت کی مرمت ہو رہی تھی۔ عمارت اگرچہ بہت وسیع ہے مگر معمولی۔ لیکن جیسا کہ سب کو معلوم ہے علی گڑھ کالج جیسی درسگاہ کی ابتداء بھی ایک پھونس کے بنگلے سے شروع ہوئی تھی۔ اس نارمل اسکول کے قیام کی سب سے زیادہ ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اس کے اجراء سے ان بلغاری قوانین کے برے اثر کی روک تھام کرنی مقصود تھی جو کسی ایسے شخص کو اسلامی مدرسہ میں ٹیچر بننے کی اجازت نہیں دیتی جو بلغاری رعایا ہے۔ متذکرہ بالا اسکول کا سٹاف بہت قابل ہے، اس کی لائبریری عمدہ ہے اور اسکول میں سے اب تک اچھے اچھے قابل ماسٹر پیدا ہو چکے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب موصوف اس مقصد کو ترقی دینے کے لیے ترکی زبان میں تعلیم کے متعلق ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔

آج سہ پہر کو میرا تعارف ایک ایسے معمر عیسائی شریف آدمی کے ساتھ کرایا گیا جنھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ایک طویل گفتگو میں بلغاریہ کی مکمل تاریخ بیان کرنے کے بعد اُنھوں نے ظاہر کیا کہ یہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ عثمانیوں کو ہم پر حکومت کرنے سے آہستہ آہستہ ہٹا دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ:

> نہیں نہیں، یہاں کچھ آزادی نہیں ہے۔ ٹرکی کے عہدِ حکومت میں دراصل ہم ملک پر حکمران تھی لیکن اب باوجود یکہ گورنمنٹ ہماری ہے، غیر ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ ہم بذاتِ خود نہ لڑائی کر سکتے ہیں اور نہ صلح کر سکتے ہیں۔ ہمیں روس کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے۔ جب کبھی ہمیں حکم دیا جاتا ہے ہم کو مجبوراً ترکی کے ساتھ لڑنا پڑتا ہے جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ترکی کی قوت کو کمزور کر دیں اور اپنے آپ کو تباہ کر لیں۔ ترک اگرچہ عدل کرنے میں سخت تھے، ان کا انصاف مساوی ہوتا تھا۔ لیکن اب ہمارے جج صاحبان غیر مطبوع جماعتوں اور مردوں کے حقوق کو غارت کرنے کے لیے اعلیٰ یوروپین ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ترک تمام مذاہب کے یکساں محافظ تھے مگر اب کئی مختلف فرقوں کے عیسائیوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ تمام خوبصورت عمارتیں جو آپ برابر دیکھ رہے ہیں ان میں سے ایک ہی نہیں بلکہ ان سب کو ہمارے گھروں کے کھنڈرات پر غیر ملکی سرمایہ داروں نے تعمیر کرایا ہے۔ آہ! جہاں جہاں آپ کو یہ مکانات نظر آتے ہیں وہاں کسی زمانہ میں ہمارے پسندیدہ گھر واقع تھے۔ ہاں ہمارے ہی گھر آباد تھے۔

شام کو میں شہر کا باغ دیکھنے کے لیے گیا اور اس اثنا میں خلیل زکی نے مجھ سے کہا کہ:

احمد فائق بھی آپ کی شام کی دعوت کرتے ہیں جہاں آپ کو بلغاری مسلمانوں کے چند ایسے لیڈروں سے ملاقات

کرنے کا موقع مل سکے گا جو آپ کو خوشی سے مطلوبہ واقفیت بہم پہنچائیں گے۔

یہ باغ ایک پارک معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے ساکن پانی کا ایک تالاب تھا۔ شفق پھولی ہوئی تھی۔ سڑک پر سلافی اور یونانی خط و خال کی عیسائی عورتیں اور مرد جرمنی اور روسی طرز کے لباس میں جا رہی تھیں، فوجی افسر بھی سفید کوٹ اور نیلی برجس پہنے ہوئے چل رہے تھے اور عورتیں عموماً پیرس کے جدید ترین لباس میں تھیں اور یہ منظر شمالی یورپ کے منظر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ صرف کبھی کبھی جبکہ کوئی البانی یا کرد کسی عمدہ لباس میں گزر جاتا تھا یا دور سے کالی اور سرخ ترکی ٹوپی دکھائی دی جاتی تھی یا برقع پوش مستورات کا سریلا قہقہہ سننے میں آجاتا تھا اس وقت میں اپنے آپ کو مشرق کی سرحد پر محسوس کرتا تھا۔

واپسی پر میں نے تمام مسجدوں میں چراغاں دیکھا کیوں کہ نئے چاند نے ماہِ رمضان کی آمد کو مشتہر کر دیا تھا۔ مسجدوں میں چراغاں ایک تو ماہِ رمضان میں کیا جاتا ہے اور یا خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم کی سالگرہ کے دن۔ مجھے آج شام کو اتنے سارے بلغاری مسلمانوں کے نمائندوں سے مل کر نہایت مسرت حاصل ہوئی۔ تقریباً سب کے سب ہونہار نوجوان ہیں جنہوں نے قسطنطنیہ میں تعلیم حاصل کی ہے اور بعض فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ بہی خواہ قوم اپنے ملک میں اسلام کے دورِ جدید کا آغاز اور منبعِ اُمید سمجھے جاتے ہیں۔ احمد فائق بھی جو ارکانِ ثلاثہ کے تیسرے ممبر ہیں، بلغاریہ کے سب سے بڑے سوداگر ہیں۔ ان کی مقامی تجارت بہت وسیع پیمانہ پر جاری ہے۔ اور ملک میں سب سے بڑی دکان کے مینیجنگ پروپرائٹر ہیں۔ اُنھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ نہایت خوشی سے بمبئی، کلکتہ اور رنگون کے تاجروں سے اسلامی تجارت کو وسیع کرنے کے متعلق نامہ و پیام کریں گے۔ یہ جلسہ آدھی رات تک ہوتا رہا۔ خلیل ذکی بے میرے ترجمان تھے اور ترکی سے جرمنی زبان میں اور جرمنی زبان سے ترکی میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ نسل، ملک، رنگ اور زبان کے فرق کے باوجود ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب اور متحد معلوم ہوتے تھے کہ گویا میں بلغاریہ میں پلا بڑھا ہوں۔ فی الحقیقت اسلامی اخوت کے یہی معنی ہیں:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس آرٹیکل کے دوسرے حصے میں میں نے اپنی گفتگو اور بحث کا نتیجہ اختصار کے ساتھ درج کر دیا ہے۔ رمضان کی پہلی تاریخ کو میں نے صبح کے وقت سرحد پر چند بے کس بلغاری مسلمانوں کے قتل کی خبر سنی جنھیں عیسائیوں نے قتل کیا تھا اور اس قتل میں جندرمہ اور پولیس نے خاص طور پر نمایاں حصہ لیا تھا۔ بلغاری جنھیں ان کی دغاباز گورنمنٹ اُبھارتی رہتی ہے، مسلمانوں کے دیہات جلانے اور لوٹنے کے عادی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ دل ہلا دینے والے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ننھے بچوں کو تلوار کے سپرد کرتے ہیں اور غیر محفوظ عورتوں کی عصمت دری کرتے ہیں۔ یہ تمام کارروائی افسروں کے بھڑکانے

اور تقویت دینے سے اس لیے کی جاتی ہیں کہ مسلمان یا تو ملک بدر ہو جائیں اور یا عیسائیت قبول کر لیں۔ سہ پہر کو میں مسلمانوں کا ایک گاؤں دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں بہت سے بوڑھے آدمی موجود تھے جن کی کمریں بڑھاپے کی وجہ سے خمیدہ ہو گئی تھیں مگر باوجود اس کے وہ نہایت فخر کے ساتھ اپنا سر بلند رکھتے تھے۔ بوڑھی عورتیں بھی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو کھیت میں کام کاج کرتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں اور اُن کے کاموں میں مدد بھی دیتی تھیں۔ یہاں کی عورتیں برقع نہیں اُوڑھتیں۔ چند لڑکیاں نزدیک ہی آہستہ آہستہ دبے لہجے میں اپنے ہاتھ دونوں رانوں پر رکھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ دو چپسیوں کی گاڑیاں ذرا فاصلہ سے کھڑی تھیں اور عورتیں اپنے بچوں کو بغل میں دبائے ہوئے جلدی جلدی اُس طرف جا رہی تھیں۔ بعض عورتیں شام کو کھانا پکانے کے لیے آگ جلا رہی تھیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ ''پریاں'' مجھے ارضِ مقدس میں لے آئی ہیں اور یہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا زمانہ ہے۔ واللہ ان لوگوں کی زندگی کیسی پاکیزہ اور سادہ ہے اور اس پر طرفہ یہ ہے کہ یہی لوگ ان لوگوں کے وحشیانہ مظالم کا شکار رہتے ہیں جو اپنے آپ کو شاہزادۂ امن یعنی مسیح علیہ السلام کی اُمت میں شمار کرتے ہیں۔ چند سال پیشتر ہزاروں تلواریں اُس ذلت کا انتقام لینے کے لیے یہاں سے باہر نکل سکتی تھیں جو ان بے گناہ کنواریوں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا، مگر اب خلیفہ کی حکومت جاتی رہی ہے۔ جبکہ میں اُن میں سے ایک بوڑھے آدمی کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی زبان سے ترکوں کی گذشتہ عظمت اور شان و شوکت کے افسانے سن رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کی چمکدار آنکھیں آسمان کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ مستقبل کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے مجھ سے اور میرے ہمراہی سے کہا کہ

''میرے بچو انتظار کرو، خدا نے اپنے دین سے علیحدگی اختیار نہیں کی ہے۔ وہ پھر اسلام کی عظمت اور شان کو دوبارہ ظاہر کر دے گا۔ ان شاءاللہ۔''

آدھی رات کو میں فلبہ سے قسطنطنیہ روانہ ہوا۔ میں یہاں اگرچہ ایک اجنبی کی طرح سے آیا تھا، تاہم رخصت ہونے پر مجھے دعویٰ کرنا پڑا کہ یہ آخری ملاقات نہیں ہے بلکہ میں ان شاءاللہ پھر آؤں گا۔

(۲)

ترکوں کے عہدِ سلطنت میں بلغاریہ میں ۲۰ لاکھ مسلمان آباد تھے لیکن روس و ترکی کی جنگ کے بعد جبکہ ملک پر ہلال کے بجائے صلیب کی حکومت قائم کر دی گئی تھی تو ہزاروں آدمی خود اپنی مرضی سے ترکی میں ہجرت کر آئے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مسلمان جو حاکم اور خودمختار رہ چکے تھے، نئے دورِ حکومت میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ اخراج کا اصلی باعث وہ سلوک تھا جو عیسائی حکومت نے اُن کے ساتھ روا رکھا۔ برادری کے اخراج سے لے کر ضبطی جائداد اور قتلِ عام تک کے تمام ذرائع اُن کے خلاف اس غرض سے استعمال کیے گئے کہ وہ ملک سے رخصت ہو جائیں۔ ان ذرائع سے جواب بھی اسی جوش و خروش سے جاری ہیں، عیسائی تعصب کو کم سے کم اتنی کامیابی ضرور حاصل ہو گئی ہے کہ مذکورہ بالا تعداد

گھٹتے گھٹتے نصف سے کم رہ گئی ہے۔ آخری سرکاری گوشواروں کے مطابق بلغاریہ میں اب مسلمانوں کی تعداد صرف ساڑھے نو لاکھ ہے جس میں دو لاکھ ''جپسی'' بھی شامل ہیں۔ دارالسلطنت میں اسلامی آبادی چھ اور سات ہزار کے درمیان ہے جس میں سب کے سب ''جپسی'' یعنی آوارہ گرد قومیں ہیں۔ خاص صوفیہ میں پچاس سے زیادہ ترک نہیں پائے جاتے۔ فلیبہ میں جو اسلامی آبادی کا مرکز ہے، ان کی تعداد جپسیوں سمیت بارہ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ مسلمان بالعموم سرحدی شہروں کے قریب دیہات میں آباد ہیں جن میں سے بعض میں خالص اسلامی آبادی ہے۔ بعض بڑے بڑے اسلامی مقامات کے نام رسچک، شمنی، رسگراد، اسکزارا، پلیونا، ایڈس اور دیڈن ہیں۔ مسلمان آبادی خالص ترکی (پومک) اور مخلوط (جپسی) نسل کی ہے۔ پومک اصلاً و نسلاً بلغاری ہیں جو خاص وہیں کے رہنے والے ہیں اور جنھوں نے مذہب اسلام قبول کر لیا ہے۔ برخلاف اس کے جپسی ایک ایسی خانہ بدوش قوم ہے جو کسی مقام کو اپنا وطن نہیں بناتی، علاوہ ازیں ان کی نسل بھی نامعلوم ہے۔ ترک آبادی کا زیادہ حصہ ہیں، یعنی ۸۰ فیصدی۔ پومک ۵ فیصدی سے زیادہ نہیں ہیں۔ باقی سب ''جپسی'' ہیں۔ ترکوں اور جپسیوں کی زبان ترکی ہے، پومک عام طور پر بلغاری زبان بولتے ہیں لیکن اس میں سے بہت سے ترکی زبان بھی سمجھتے ہیں۔

دُنیاوی وجاہت کے لحاظ سے مسلمان تین جماعتوں میں منقسم ہو سکتے ہیں۔ پہلی جماعت سوداگروں کی اقل تعداد پر مشتمل ہے جو ملک کی تجارت میں بلغاری عیسائیوں کے ساتھ مساوی حقوق کے حصہ دار ہیں، لیکن چوں کہ بڑے پیمانہ کا تمام کاروبار غیر ملکی سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہے، اس لیے ان کی تجارت زیادہ نہیں۔ احمد فائق بھی صرف ایک ایسے مسلمان اور بلغاری سوداگر ہیں جو نو آبادیوں اور براعظم کی تجارت کے نگران ہیں۔ متوسط جماعت تمام تر زراعت پیشہ ہے۔ ترکی عہدِ حکومت میں وہ بہت خوش حال تھی مگر اب اُن کی زندگی غلاموں کی سی ہے۔ بھاری ٹیکسوں اور تکلیف دہ کرایوں کے اقتصادی بوجھ نے، جائداد کی ضبطی، برائے نام قیمتوں پر زمینوں کی جبریہ فروخت، گھروں کی تباہی اور عورتوں کی عصمت دری کے سیاسی دباؤ نے، جبریہ تبدیلِ مذہب کے لیے عیسائی تعصب نے، مخالف پڑوس کے سوشل دباؤ نے، الغرض ان تمام باتوں نے انھیں محتاج، مصیبت زدہ، اور بے کس بنا دیا ہے۔ تیسری جماعت جپسیوں کی ہے جو تکبر و دیگر سامانِ تکبر سے بالکل نا آشنا ہیں۔ اُن کی زندگی ایک مسلسل آوارہ گردی کی زندگی ہے۔ وہ دن کے وقت دھوپ میں بیٹھ کر سوچ و بچار کرتے اور رات کو لیٹے لیٹے ستاروں پر غور کرتے ہیں۔ وہ بھی اسلام کے ان دشمنوں کی بے پروا بے رحمی اور مظالم سے سخت تکلیف اُٹھاتے ہیں مگر وہ اپنی تکلیفات کو بعینہٖ اسی طرح برداشت کرتے ہیں جس طرح سے کہ ہرنوں کی ڈار شکاری جانوروں کی لوٹ کھسوٹ کو برداشت کرتی ہے۔

تمام مسلمان سنی المذہب حنفی ہیں۔ اُن کی زندگی میں مذہب کا ایک نمایاں حصہ پایا جاتا ہے۔ بلغاریہ میں تقریباً ۱۲ سو مسجدیں ہیں جن میں سے چار سو اور پانچ سو کے درمیان بڑے شہروں میں واقع ہیں۔ خاص فلبہ میں ۱۸ مساجد ہیں۔

مسجدوں کی نگرانی اوقاف سے کی جاتی ہے لیکن متولیوں کی جہالت کی وجہ سے ان کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ گورنمنٹ ان کے انتظام میں ہمیشہ دخل انداز رہتی ہے جس کا نتیجہ عموماً ضبطی ہوا کرتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی زندگی خالص طور پر مذہبی ہے۔ وہ سارے راست باز، ایماندار اور دلیر ہیں اور یہ صفات زیادہ تر اس لیے نمایاں معلوم ہوتی ہیں کہ وہ ایک ایسی قوم کے دوش بدوش رہتے ہیں جو سچائی، ایمانداری اور دلیری جیسی پاکیزہ صفات سے بالکل معرا ہے۔ مستورات کی منزلت ایسی ہی ہے جیسے کہ خود ترکی میں اور وہ اپنی ہندوستانی بہنوں کی نسبت زیادہ آزادانہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ پردہ بس یہیں تک محدود ہے کہ باہر جاتے وقت ''یشمک'' اوڑھ لیا جاتا ہے اور عورتوں کی مجالس میں مردوں کو نہیں بلایا جاتا۔ جیسا کہ مجھ سے مسلمانوں اور عیسائیوں نے کہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی گھریلو زندگی عیسائیوں کی نسبت زیادہ خوش اور پاکیزہ ہے۔ کثیر الازدواجی شاذ و نادر ہے اور اکثر جگہ بالکل ہی نہیں پائی جاتی، اور دیہاتیوں اور جپسیوں تک میں عورتوں کا بے حد ادب روا رکھا جاتا ہے۔ عقد، جہیز، طلاق اور وراثت کے متعلق تمام تنازعات کے فیصلہ جات میں مسلمانوں کے قانون کے استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ صدر مفتی کی عدالت صوفیہ میں ہے۔ فلیبہ میں یہی ایک مفتی عدالت کیا کرتے ہیں۔

ترکی کی طرح بلغاریہ کی اقتصادی حالت بھی تمام مشرقی ممالک سے مختلف نہیں ہے۔ غیر ملکی سرمایہ دار جسے فائدہ اُٹھانے کے کافی ذرائع میسر ہیں، مغربی تہذیب وتمدن کے فوائد سے متاثر کر کے ملک کو غریب اور کھوکھلا کرنے کی عظیم الشان مہم میں برابر مصروفیت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ مالکانِ صنعت وحرفت تمام کے تمام یا تو روسی ہیں یا غیر ملکی یہودی اور یا اہلِ آرمینیا۔ بلغاری عیسائی اور مسلمان چند ایسی مقامی صنعتوں کے مالک ہیں جن کا دارومدار صرف زراعت پر ہے۔ ان میں مسلمان، عیسائیوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ غیر ملکیوں کے طرزِ عمل اور حکومت کی مدد اور حفاظت کے سبب عیسائیوں کی اقتصادی حالت کی ترقی یقینی ہے۔ اعلیٰ سلوک جو اُن کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے غالباً ان کو اس بڑی مصیبت سے بچائیگا جس کا انھیں خطرہ ہے۔ لیکن اسلامی سرمایہ اور محنت کی راہیں دن بدن کم ہو رہی ہیں اور گورنمنٹ کا یہ مقصد ہے کہ تجارتی حلقوں میں سے مسلمانوں کو کلی طور پر نکال دے۔ مسلمانوں کی زیادہ تر تعداد زراعت پیشہ ہے۔ بلغاریہ میں زمین کا نرخ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ آخری دس سالوں میں زمین کی قیمت دس گنا ہوگئی ہے۔ مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زمینوں اور جائدادوں کو برائے نام داموں پر فروخت کر دیں اور پھر محتاج زندگی سے مجبور ہو کر ہجرت کر جائیں۔ اگر وہ عدل چاہنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں تو مال واسباب کے ساتھ انھیں اپنی جان بھی ضائع کرنی پڑتی ہے۔ سال بھر میں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس روز کہ چند مسلمان بلغاری عیسائیوں کے سلوک سے تنگ آ کر ترکی سرحد میں نہ داخل ہوتے ہوں۔

عہد نامہ برلن کے مرتب ہونے کے بعد بہت سے مسلمان ترک ملک کے انتظام میں شریک تھے۔ بلغاری مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد فوج میں ذمہ داری کے عہدے رکھتی تھی، لیکن یہ عمل عرصہ تک جاری نہیں رہا اور رفتہ رفتہ تمام مسلمانوں

کوملکی اورفوجی عہدوں سے یک لخت محروم کر دیا گیا۔ چنانچہ اب سارے ملک میں ملکی یا فوجی عہدے پر کوئی بھی مسلمان مامور نہیں ہے۔ خلیل ذکی بے جوایک پومک (بلغاری مسلمان) ہیں آخری مسلمان تھے جوفوجی کالج میں پروفیسری کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں ملک کے اخراجات کے لیے ان سے بڑا بھاری ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے مسلمان محکمۂ پولیس کی ملازمت سے بھی مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ دونوں طرف سے بے بس ہوکر وہ اپنے ہی حال میں رہنے کے لیے مجبور ہیں۔ ان سے کہہ دیا گیا ہے کہ بلغاریہ عیسائیوں کے لیے ہے۔ مسلمانوں کوعہدنامہ کی رُو سے جوحقوق حاصل ہیں اورجن کی کفالت بین الاقوامی قوانین سے کی گئی ہے، دن دہاڑے پاؤں تلے روند دیے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے عدل وانصاف کے دروازے بالکل بند ہیں۔ اُن کی حالت روس کے یہودیوں سے بھی خراب خستہ اور گئی گزری ہے۔ ان کی زندگی ایک قسم کی ایسی غلامی ہے جس میں اُن کی بے قدری کی سبب اُنھیں پناہ اور خاطر جمعی بھی حاصل نہیں ہے۔

لیکن مسلمان متحد ہو گئے ہیں اوران تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ جونئی زندگی اور عام بیداری آج [دُنیائے] اسلام میں ظاہر ہورہی ہے اس نے ان کومتاثر کر دیا ہے۔ یہ جوشِ حیات جوقدرت کی دوسری طاقتوں کی طرح تھم نہیں سکتا، ان کے لیے بھی وہی نتائج پیدا کرے گا جووہ باقی اسلامی دُنیا کے لیے پیدا کرنا چاہتا ہے اوراس امر سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ علاوہ ازیں وہ سچے مومنوں کی طرح یہ اطمینان دہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر بالفرض ہم اس کشمکش میں جاں بحق تسلیم ہو گئے توکم سے کم ہمیں یہ توخوشی ہے کہ صرف اسلام کی آخری کامیابی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہے۔ بلغاریہ کے مسلمان مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے بعد قسطنطنیہ کی جانب نظر رکھتے ہیں۔ بلغاریہ کی تمام مساجد میں خطبہ ہز میجسٹی سلطان محمد خامس کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے مسلمانوں کوخلافتِ عظمیٰ سے علیحدہ کرنے کے لیے ہزارطرح کی کوششیں کی ہیں مگر یہ امر ناممکن ہے۔ ایک نوجوان آدمی نے جوحال ہی میں یورپ سے فارغ التحصیل ہوکر آئے ہیں، میرے سوال کے جواب [میں] نہایت غصے کے لہجہ میں کہا کہ

''اگر وہ ہماری مساجد کومسمار کرڈالیں گےتوبھی ہم اپنے مکانوں کی بلندیوں سے خطبہ پڑھیں گے اوروہ سن لیں گے کہ ہم خلیفۃ المسلمین کا مقدس نام پڑھ رہے ہیں۔''

اٹلی وترکی جنگ کو یہاں کے لوگ جہاد یہ لڑائیوں کی ابتداء خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ دوسری لڑائی بلقانیوں سے ہوگی۔ اوراب اُنھوں نے تیسری جنگ کے متعلق بھی پہلے سے مطلع کر دیا ہے۔ اگران خیالات کومبالغہ آمیز بھی خیال کرلیا جائے توہمیں ایک گھڑی کے لیے اس امر کوفراموش نہیں کرنا چاہیے کہ بلغاریہ کے مسلمان نہایت ظالمانہ اورغیر منصف حکومت میں رہتے ہیں۔ بلغاریہ کے مسلمانوں نے نہایت نہایت فراخدلی اور فیاضی سے طرابلس کے مصیبت زدوں کو مالی امداد پہنچائی ہے اورطرابلس میں اسلامی حکومت قائم رکھنے کے لیے بہت سے بلغاری مسلمان والینٹیر کی حیثیت میں اب تک جنگ کررہے ہیں۔ بلغاری مسلمانوں کی کوئی سیاسی انجمن نہیں ہے لیکن بشرط

امکان وہ ایک کانگریس کی بناڈالنا چاہتے ہیں۔ان کے پاس صرف ایک ہی روزانہ اخبار (بلقان) ہے جسے ادھم روحی بے ترکی زبان میں شائع کرتے ہیں۔ یہ اخبار ۸ سال ہوئے جاری کیا گیا تھا اور بلغاریہ اور ترکی میں اس کی بہت زبردست اشاعت ہے۔اخبار کی گورنمنٹ کے ساتھ ہمیشہ جھڑپ رہتی ہے۔ یہاں تک کہ پارسال اس کے ایڈیٹر کو ۶ ماہ کی سزا دی گئی تھی۔غیر ممالک کے لیے اس کا سالانہ چندہ ۲۳ روپے ۴ آنے ہے۔

لیکن کسی قوم کی باقاعدہ ترقی میں سب سے بڑا حصہ صحیح طریقۂ تعلیم کا ہے اور اس کو بلغاریہ کے مسلمانوں نے پورے طور پر سمجھ لیا ہے۔لیکن بلغاریہ میں مسلمانوں کو تعلیم کے معاملہ میں بے انتہا مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔تمام اسلامی تعلیمی درسگاہوں کی نگرانی اوقاف سے کی جاتی ہے۔ جنگ کے بعد گورنمنٹ نے تمام مدارس اور مکاتب کی عمارتوں پر قبضہ کرلیا تھا اور چنانچہ وہ اب سرکاری دفاتر اور سرکاری مدارس کے استعمال میں آرہی ہیں۔ جنگ کے آغاز سے لے کر اب تک نصف سے زائد اوقاف کو کسی نہ کسی بہانے سے ضبط کرلیا گیا ہے اور اس طرح سے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سامانِ آمدنی کو جبراً چھین لیا گیا ہے۔تعلیم کے لیے جو ٹیکس مسلمانوں سمیت تمام آبادی سے وصول کیا جاتا ہے وہ مسلمانوں کی تعلیم پر کبھی خرچ نہیں کیا جاتا۔گورنمنٹ کا مقصد یہ ہے کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کو سرکاری مدارس میں تعلیم پانے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ وہاں بلغاری زبان میں تعلیم پائیں اور اپنی مادری زبان سے جو کہ ترکی ہے بالکل بے بہرہ رہیں اور اپنے مذہب اور نصِ قرآن شریف سے ناآشنا ہوجائیں۔لیکن مسلمانوں نے نہایت دلیرانہ طور پر اس کو منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بلغاریہ کے مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ نوجوان جماعت میں سے جو ہونہار آدمی قسطنطنیہ یا یورپ سے فارغ التحصیل ہوکر آتے ہیں وہ سلطنتِ عثمانیہ میں جاکر ملازمتیں کرتے اور بالآخر وہیں کی رعایا ہوکر آباد ہوجاتے ہیں۔اس سے بہت بڑی دماغی اور سوشل کمی واقع ہوگئی ہے۔ان حالات پر نظر ڈالنے کے بعد کوئی شخص یہ سن کر تعجب نہیں کرے گا کہ جہاں بلغاریہ میں تعلیم یافتہ عیسائیوں کی تعداد فیصدی ساٹھ ہے وہاں مسلمانوں کی صرف فیصدی دس ہے۔مسلمان نوجوان صرف مکاتب میں تعلیم پاتے ہیں جہاں انھیں ابتدائی قسم کی مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔وہاں کے مکاتب ہندوستان کی طرح سے نہیں ہیں۔خلیل ذکی بے نے ان میں ایک نمایاں اصلاح کردی ہے اور جدید طرز کے بہت سے مدارس فلبہ، وارنہ، رسچک، ویڈن اور دیگر مقامات میں جاری کردیئے گئے ہیں۔اس سال فلبہ میں ایک نارمل اسکول قائم کیا گیا ہے جس کا مقصد ان قوانین کے بُرے اثرات کو روکنا ہے جن کی رُو سے کوئی شخص جو بلغاری رعایا نہیں ہے، کسی اسلامی مدرسہ میں ٹیچر (مدرس) نہیں بن سکتا۔مسلمان ہر سال ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کرتے ہیں۔اُمید کی جاتی ہے کہ اس سے بہت مفید نتائج مرتب ہوں گے۔کل مدارس کی تعداد تقریباً ۱۴۰۰ ہے جن میں عورتوں اور مردوں کو ملاکر ۱۷۰۰ مدرس ہوتے ہیں۔ مدارس جانے والے لڑکوں کا شمار فی الحال ۴۲ ہزار اور لڑکیوں کا ۱۰ ہزار ہے۔ان دونوں گوشواروں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان، بلغاریہ کے مسلمانوں سے کیا کچھ سبق حاصل کرسکتے ہیں۔

بلغاریہ کے مسلمانوں کے مستقبل پر کچھ رائے زنی کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے اس نوجوان آدمی کی رائے پر پورا یقین ہے جنھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ ''اس کا دارومدار ترکی کے مستقبل پر ہے'' اور اسی قول کی تائید ایک اور نوجوان مسلمان نے بدین الفاظ کی تھی کہ ''تمام اسلامی دُنیا کا مستقبل ترکی کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے'' اور دراصل یہی درست بھی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر محمد زاہد نے یہ تاریخ دی ہے لیکن انٹرنس امتحان کے نتیجے کے اعلامیے میں ان کی عمر ۱۵ سال ۸ ماہ درج ہے۔ دیکھیے پنجاب گزٹ، حصہ سوم، ۱۹ر جون ۱۹۰۳ء، ص ۸۵۸

۲۔ محمد زاہد، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری: حیات اور کارنامے، کراچی، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ص ۴۴-۴۵

۳۔ سرویا = سربیا، صربجہ۔ جنوب مشرقی یورپ کی ایک سابقہ سلطنت، جو جزیرہ نمائے بلقان کے شمال میں واقع تھی اور اب یوگوسلاویہ میں شامل ہو چکی ہے۔ سربیا کا صدر مقام بلغراد تھا۔

۴۔ بلقان کی ایک ریاست۔ اس کی نسبت ایک ترکی النسل قوم بلغار سے ہے۔

Abstract

This article presents two Urdu rare essays of Abdul Rehman Bijnori, titled, Soroya mein Islam (Islam in Serbia) and Balgharia mein Islam (Islam in Bulgaria). Bijnori completed his law education from the Lincolns' in and earned PhD from Germany on Islamic Jurisprudence. Both the essays were published in Hamdard ably edited by Maulana Muhammad Ali Johar on 11 June 1913 and 22 June 1913 respectively. The writer of this article claims that the essays presented here have neither been included in Baqiat-e Bijnori (1940) nor in Yadgar-e Bijnori. The aforesaid compilations comprising the writings of Bijnor edited shortly after he died. Muhammad Zahid who wrote his dissertation Dr Abdul Rehman Bijnori: hayat aur karname (Dr Abdul Rehman Bijnori: Life and works) has not consulted both the articles.

Keywords: Islam in Serbia, Islam in Bulgaria, Abdul Rehman Bijnori, Islamic Jurisprudence, Hamdard, Maulana Muhammad Ali Johar, Baqiat-e Bijnori, Yadgar-e Bijnori, Dr Abdul Rehman Bijnori: Life and works